علی اکبر ناطق

پانڈوکے

''بھئ علی، مجھے معلوم ہےتو قصہ گووؤں کے قبیلے کا آدمی ہے۔ لازماً تیرے بزرگ شاہوں کے چاپلوس رہے ہوں گے۔'' شہزادلالہ نے اپنی ٹانگیں میز پر پھیلاتے ہوئے سگریٹ سلگائی۔ ''لیکن میں تیری رگ رگ سے واقف ہوں۔ تو ایک فراڈیا اور پرلے درجے کا ڈرامابازہے۔ یہ میں جانتا ہوں۔

''میں تیری اس بات سے کیا مطلب لوں؟''

''اس کے سوا کچھ نہیں کہ آج اگر آپ مجھے واقعی ایک سچی کہانی سنادیں جس میں ذرابرابر مبالغہ نہ ہواور وہ اسی قدر دلچسپ بھی ہو۔ میں پھر دیکھوں!''

''دیکھو بھئ شہزادلالہ، پہلی بات تو یہ ہے، میں ایک افسانہ نگار ہوں۔ کوئی محدث نہیں کہ آپ کے معیار پر پورا اُتروں۔ دوئم مجھے اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں کہ آپ مجھے فراڈیا نہیں بلکہ ولی سمجھیں۔ میری آپ کی دوستی کو بیس سال ہو گئے۔ غالباً اتنے ہی برس ہمیں بالغ ہوئے بھی ہو گئے ہیں۔ اس عرصے میں آپ آڑھتی بن گئے جو ظاہر ہے میں قیامت تک نہیں بن سکتا۔ بلکہ تمہیں تو معلوم ہے آج تک لکھنے لکھانے کے علاوہ جس کام میں بھی ہاتھ ڈالا، ذلت اُٹھائی۔ اب اگر جھوٹ بھی ڈھنگ سے نہ بول سکتا تو لعنت ہے مجھ پر۔''

''اس کے باوجود میں آپ سے ایک حقیقی دلچسپ واقعہ سنانے کا تقاضا کروں گا۔''

''اگر نہ سنا سکوں تو؟''

''تو میں آپ کے دروازے پر 'ابلیسِ دوراں' کی تختی لگا دوں گا۔''

''خیر یہ تو آپ کی بندہ پروری ہوگی ورنہ مجھ میں اتنی سوجھ بوجھ کہاں؟ بہر حال آپ کا اصرار ہے تو سنائے دیتا ہوں لیکن اس میں ذرا میری آبرو جانے کا خطرہ ہے۔''

''اس کی آپ زیادہ فکر نہ کریں۔ وہ تو پہلے ہی نہیں۔''

''اچھا پہلے یہ بتاؤ کہ آپ کی نظر میں میرا مذہب کے بارے میں علمی سرمایہ کتنا ہوگا؟''

''بالکل صفر۔ زیادہ سے زیادہ مرغا ذبح کر سکتے ہو۔''

''ٹھیک ہے، بھابھی کو بہترین قسم کی چائے کا کہہ کر آجاؤ۔ اس عرصے میں غور کر لوں کہ کہانی کہاں سے

شروع کروں۔‘‘

شہزادلالہ کے جانے کے بعدمَیں نے اپنے ذہن پرزور دیااورایک اہم واقعے کوترتیب کرلیاجس کی بناپر میرے اکثر نقّاد مجھے واقعہ نگار کہتے ہیں ۔ مجھے اس وقت اُن کی رائے پرہنسی بھی آئی کہ وہ کتنی سادگی سے میری کہانی کے اہم گوشوں کونظرانداز کردیتے ہیں۔بہرحال مجھے کہانی کے تمام کرداروں کوگرفت میں لینے میں بیس منٹ خرچ ہوگئے۔اس عرصے میں شہزادلالہ چائے کی ٹرے رکھ کرسامنے بیٹھ چکا تھا۔

’’سنیے صاحب!‘‘ مَیں نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔’’ آپ کوتومعلوم ہی ہے، مَیں نے کتنا عرصہ مسجدوں کے مناراورگنبد بنائے۔دروازوں کی محرابیاں، ڈاٹیں، مغلیہ طرز کی صراحیاں اورایرانی مینا کاری کا کام دروازوں پرجس ہنرمندی سے کرتا ہوں یہ بات توآپ سے ڈھکی چھپی نہیں۔اسی سلسلے میں میری شہرت جب اپنے شہرسے باہرنکلی تومجھے قصور کے ایک قصبے’پانڈوکی‘ میں مسجد کی تعمیر کا کام مل گیا۔یہ وہی قصبہ ہے جس میں بابابلھے شاہ پیداہوااوریہ کہتے ہوئے وہاں سے نکل گیا۔

بلھیا جے تُوں غازی بننا ایں، لکیں بنھ تلوار
پہلاں رہنگڑ پانڈو ماریں پچھوں کافر مار
اُجڑ گئے پانڈوکے تے نِگھر گیا سدھار‘‘

’’واہ بھئی، بلھے شاہ بھی کیا جہاں دیدہ شخص تھا۔خدا کی قسم اُس نے عین میرادماغ پایا ہے۔کاش وہ یہ جہاد کرتا ہواہمارے قصبے تک آتا۔‘‘ شہزادلالہ کا اشارہ اپنے قصبے کی کمبوہ برادری کی طرف تھا۔

’’دیکھوبھئی راہ میں ٹوکوگے تومَیں کہانی سے پھسل جاؤں گا۔‘‘

’’ہاں جناب، آپ کو’پانڈوکی‘ میں مسجد کی تعمیر کا کام مل گیا، پھرکیا ہوا؟‘‘

’’ہاں تومَیں کہہ رہا تھا(چائے کی چسکی لیتے ہوئے) یہ قصبہ پندرہ ہزار کی آبادی پرمشتمل تھا۔کوئی عورت زیورسے خالی نہیں اورکوئی مرد بندوق سے آزادنہیں۔قصبے کے بازار کھلے کھلے تھے جن پردورویہ پیپل، نیم اور بیریوں کی قطاریں دورتک نکلتی چلی گئی تھیں۔بہت بڑا چوک، سوفٹ قطر کا ہوگا۔لوگوں کے گھر کھلے اور بڑے بڑے احاطوں سے منسلک تھے۔مسجد کے چاروں طرف ساٹھ فٹ کی چوڑی سڑک قصبے سے مسجد کوکاٹ دیتی تھی۔ پہلے دوچاردن تومَیں نے اس خوبصورت قصبے کوتجسس سے دیکھا گلیوں اور بازاروں میں گھوم پھرکراُن کی دیدہ زیبی سے لطف اندوز ہوا۔بازاروں میں صاف پانی کے نالے درختوں کی بہاردکھاتے تھے۔لیکن اس سیر

کے بعد بالکل مَیں اپنے آپ میں سمٹ آیا۔ جس کا سبب جلد ہی آپ کو معلوم ہو جائے گا۔ اگر چہ مَیں پچاس فٹ کی بلندی پر کھڑا میناروں کا کام کرتا تھا لیکن پیپلوں کی بلندی اس سے بھی زیادہ ہونے کی وجہ سے میری سامنے والے گھروں کے صحنوں میں کھلی نظر نہ جاتی۔ ایک دفعہ مسجد کے عین سامنے والے گھر سے حلقہ سا نور کا چھپا کا پڑا جس سے میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ یار لالہ کیا بتاؤں ایسا چہرہ کہ سورج بھی اُس سے روشنی تاپے۔ سر کے بال گھٹنوں تک تو ہوں گے ہی۔ دیکھتے ہی میرے تو حواس مختل ہو گئے۔ اب کام تو مَیں مینار پر کرتا، نظر دن بھر اُس صحن میں رہتی۔ ایک دن میرے ساتھ کام کرنے والا مزدور میری یہ کیفیت بھانپ ہی گیا۔ کہنے لگا، 'کیا دیکھتے ہو راج صاحب؟ ان تِلوں میں تیل نہیں۔ اپنے کام کی خبر لیں۔ قصبے کے حالات خراب ہیں۔' اُس کے اس اشارے سے مَیں فوراً سنبھل گیا بلکہ اُس کے بعد مزدور کی چاپلوسی بھی شروع کر دی کہ کہیں کسی کو خبر نہ کر دے اور شکر ہے اُس نے یہ راز اپنے تک ہی رکھا۔ ویسے بھی پھر کبھی وہ نور نظر نہ آیا۔ البتہ اگر کبھی انجانے میں نظر اُدھر اُٹھ ہی جاتی تو اُس گھر کی چھتوں پر جا بجا کبوتروں کی استادہ چھتریاں میرا منھ چڑانے لگتیں۔ بہر حال کچھ ہی دن بعد مَیں نے اس طرف کا خیال چھوڑ دیا۔''

''تو گویا آپ دستبردار ہو گئے۔ خیر یہ تو اچنبھے والی بات نہیں تھی کیونکہ بزدلی آپ کو وراثت میں ملی ہے۔''

''یہ بات نہیں لالہ جی، قصبہ ذہنی طور پر تھا ہی افغانستان۔ پل میں تولہ پل میں ماشہ۔ آپ سنیں تو سہی۔''

''بات کرتے جائیں، مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہاں کیا کیا عجوبے بستے ہوں گے۔ جہاں سے بلھے شاہ ہاتھ جھاڑ کے قصور روانہ ہو گیا ہو اُس قصبے کے لوگ کوئی ایسے ویسے تھوڑے ہی ہوں گے۔''

''ویسے تو ہر چیز چونکا دینے والی تھی لیکن وہاں جا کر جو پہلا حادثہ پیش آیا پہلے اُسی سے آغاز لیتے ہیں۔ مسجد کے سامنے جیسا کہ مَیں اوپر بتا آیا ہوں۔ چوڑی تارکول کی سڑک جس کے دوسری طرف چار پانچ پیپل کے درخت تھے۔ رشید نام کا ایک پاگل پیپلوں کے سائے سے ہٹ کر عین چوک میں تارکول کی سڑک پر صبح چھ بجے آ کھڑا ہوتا، آٹھ بجتے، دس بجتے، بارہ ہو جاتے، سہ پہر حتیٰ کہ شام اور پھر عشا بھی وہیں کر دیتا۔ جون جولائی کی کڑی دوپہروں میں پسینہ اُس کے اوپر سے لے کر نیچے تک بہا چلا جاتا لیکن وہ وہیں پہ جما رہتا اور مسجد کے دروازے کی طرف، یعنی جہاں میں کام پر لگا ہوا تھا، دیکھتا رہتا۔ گاڑی بان، ٹریکٹر یا کار والے بڑی احتیاط سے خود اِدھر اُدھر سے ہو کر گزر جاتے مگر رشید میاں کے ارادے محکم تھے۔ وہ اپنے پاؤں کی زمین نہ چھوڑتا۔ مجھے انتہا درجے کی حیرانی نے گھیر لیا کہ یہ شخص آخر ہے کیا چیز؟ نہ کچھ بولتا ہے۔ صبح سے لے کر رات تک کچھ کھاتا پیتا نہیں اور دھوپ میں کھڑا سوکھتا رہتا ہے۔ کوئی شخص اُسے کچھ کہنے کی جرأت بھی نہیں کرتا۔ ایک دن

اُکتا کر میں نے کہا 'رشید بھائی آپ جو سارا دن تارکول کی سڑک پر کھڑے جولائی کی دھوپ تاپتے ہو، تھوڑا اُدھر پپلوں کے سائے میں کیوں چلے نہیں جاتے۔' وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ 'پاگل کہیں کا، او احمق کیا سردیاں نہیں آئیں گی'؟

''بھئی شہزادلالہ! خدا گواہ ہے میں چکرا سا گیا اور پھر شرمندہ ہو کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اُس کے بعد مَیں اُس سے کبھی ہم کلام نہیں ہوا۔''

''بس اتنی سی بات تھی۔ یہ تو کوئی اہم قصہ نہ ہوا۔ ایسے واقعے تو آئے روز ہمارے ہاں ہوتے ہیں۔''

''یار ایک تو تم میں یہ خرابی ہے کہ بات ختم ہونے سے پہلے ہی فیصلہ سنا دیتے ہو۔ پہلے پوری کہانی تو سن لو۔''

''اچھا بھئی، کہیے!''

''ہاں کہتا ہوں، لیکن فی الحال اس رشید صاحب کو یہیں پر روک کر بات ایک نئے سرے سے شروع کرتے ہیں۔

''مجھے اس قصبے میں آئے ہوئے ایک ماہ ہو گیا تھا اور انتہا کا پریشان تھا۔ قصبے میں کوئی جگہ یا گھر ایسا نہ تھا جہاں سے کتاب یا کسی اخبار کا ٹکڑا ہی پڑھنے کو مل جائے۔ اِدھر میرا ان چیزوں کے بغیر معدہ خراب ہو رہا تھا۔ آخر میں نے ایک دوکاندار سے، جو روزانہ قصور شہر سے تازہ سبزی اور سودا لے کر آتا تھا، کہا کہ وہ روزانہ میرے لئے ایک اخبار اور ہر تیسرے دن کوئی کتاب خرید لایا کرے۔ اس کام کے لئے میں اسے نقد پیسے دے دیتا اور چاپلوسی الگ کرتا۔ اخبار کی حد تک تو وہ وہی لایا جس کا کہا گیا تھا البتہ پہلے دن جو کتاب لایا وہ قوتِ باہ کے مجرب نسخے تھی۔ خیر اس میں اُس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ یہ اُس قصبے کی کرامت تھی۔''

''کیوں، کیا وہاں حکیموں کے خاندان بستے تھے؟''

''بس سنتے جاؤ، اور بیچ میں مت ٹوکو۔

''آٹھ دس ہوٹل تھے جن پر آٹھ پہر بلیو پرنٹ چلتے اور جوا کھیلا جاتا۔ جس شخص پر عدالت میں مقدمہ نہ چل رہا ہوتا وہ معززین اور شرفا کی صف سے خارج سمجھا جاتا۔ پورے ضلع کے اَسّی فیصد وارداتیے اسی قصبے کی دین تھے۔ کوئی دن ایسا نہ تھا جب کسی گلی یا بازار میں ٹھاہ ٹھاہ نہ ہو گئی ہو۔ آج کسی کی ٹانگ ٹوٹی تو کل آنکھ پھوٹی، جو روز امن کا گزرتا اسے نحوست کا دن سمجھا جاتا۔''

''جھگڑا کس بات پر ہوتا تھا؟''

’’بس یونہی، کہ منیرے کا کبوتر میری چھتری پر کیوں آ بیٹھا۔ یا پھر شریف کی بھینس ہمارے بازار سے گزرتے ہوئے گوبر کیوں کر گئی؟‘‘

’’یار ایسی حالت میں آپ وہاں کام کیسے کر رہے تھے؟‘‘ شہزاد لالہ متوحش ہو کر بولا۔

’’بھائی، یہ آپ کا سوال ٹھکانے کا ہے۔ ویسے تو وہاں پیپلوں کے پتوں میں بھی آسیب چھپے تھے لیکن اس کے باوجود دو باتیں بہت مثبت تھیں۔ میرے خیال میں اُنہی کی وجہ سے قصبہ ابھی تک آباد تھا۔ جیسا کہ مَیں بتا چکا ہوں وہاں بلھے شاہ پیدا ہوا تھا۔ اس کے والد اور والدہ کے مقبرے وہیں پر موجود تھے۔ اب یہ وہاں کی رسم تھی کہ جو شخص اُن مقبروں میں پناہ لے لے وہ چاہے کتنے ہی بڑے خطرے میں کیوں نہ ہوتا اسے عافیت حاصل ہو جاتی۔ پھر معاملہ افہام و تفہیم سے طے کرنا ضروری سمجھا جاتا۔ خدا جانے یہ اچھی بات اُن گنواروں میں کیسے پیدا ہو گئی اور یہ روایت صدیوں سے چلی آتی تھی۔ جس کی ابھی تک خلاف ورزی نہ ہوئی۔ لہٰذا مَیں نے یہ سوچ لیا تھا کہ اگر کچھ گڑبڑ ہوئی تو یہیں پر آ کر پناہ لے لوں گا۔ دوسری بات یہ کہ میں مسجد کا معمار ہونے کی وجہ سے سارے قصبے کا مہمان تھا۔ آپس میں تو وہ جو کرتے، کرتے لیکن میری بہت عزت کرتے۔ اگر ایک آدمی چائے لے کر آ رہا ہے تو دوسرا اُس کی ضد میں میٹھی لسّی کا جگ بھر لایا۔ تیسرے نے اُن دونوں کو مات دی، وہ دیسی مرغے کا ڈونگا بھون لایا۔ یوں میرے دن اچھے گزرنے لگے۔ ایک ایک دن میں چار چار طرف سے کھانے کی دعوتیں آنے لگیں لہٰذا مجھے اُن کے دنگا فساد سے کچھ واسطہ نہ رہا۔ فقط کھانے پینے سے مطلب تھا۔ البتہ رہنے کے لئے میں کسی بھی گھر میں تیار نہ تھا کہ کسی بھی وقت فائرنگ شروع ہو کر گولی میری کنپٹی پر آ کر لگ سکتی تھی۔‘‘

’’پھر رات کا ٹھکانہ کہاں رکھا؟‘‘

’’اول تو دس دن مولوی صاحب کے گھر رہا۔ پھر وہاں سے بھاگ نکلا اور مسجد میں سونا شروع کر دیا۔‘‘

’’کیا مولوی صاحب قومِ لوط سے تھے؟‘‘

’’بھئی ایک تو تم واہیات ایسے ہو کہ بندے کی شرافت ہوا ہو جاتی ہے۔ وجہ یہ تھی کہ مولوی صاحب کا مکان بہت تنگ تھا دوئم اُس کی علمی شخصیت ایسی بے باک تھی کہ مجھے میر صاحب کی طرح اپنی زبان خراب ہوتی نظر آئی۔ مثلاً ایک دن لاؤڈ سپیکر پر جمعہ کا خطبہ دیتے ہوئے فرمانے لگے:

> دیکھئے اصحابِ قصبہ! عورت کا فرض ہے کہ وہ دو سال تک بچے کو دودھ پلائے۔ یہ شرعی قانون ہے لیکن حالت یہاں یہ ہے کہ ابھی ایک بچے کو پیدا ہوئے سال پورا نہیں ہوتا اور دوسرا بچہ پھڑک کر باہر آ جاتا

ہے۔حتیٰ کہ چار سال میں آٹھ آٹھ بچوں کی لائن لگ جاتی ہے۔نالائقو! ہمارے قصبے کی عورتیں کیا ہیں
چلتی پھرتی گلٹر یائیں ہیں گلٹر یائیں۔

''حضرت یہ سن کر میں تو لاحول پڑھتا ہوا باہر نکل آیا۔اُدھر لوگوں کی یہ حالت کہ سبحان اللہ، جزاک اللہ سے داد دیے چلے جاتے ہیں۔اُس دن کے بعد میں نے مولوی کے ہاں رہنے سے توبہ کر لی اور سات آٹھ روز مسجد میں گزارے۔''

''پھر اُس کے بعد کہاں رہے؟''

''اُس کے بعد میری دوستی شریف حسین سے ہوگئی۔یہ مجھے پورے قصبے کا ولی نظر آیا۔وہاں کا واحد آدمی تھا جو پانچ وقت آ کر مسجد میں با جماعت نماز پڑھتا، بالکل خاموش رہتا اور اکثر میرے ساتھ قصبے والوں کے دنگا فساد کا گلہ شکوہ کرتا۔کبھی کبھی چھوٹے موٹے مذہبی مسائل مثلاً غسل، وضو، جنازہ اور نکاح کی بابت بھی گفتگو کر لیتا۔چونکہ میرا حساب وہاں اندھوں میں کانا راجہ جیسا تھا، لہٰذا اپنی علمیت بگھارنے کے لئے ان مسائل پر سیر حاصل گفتگو کرتا۔نکاح کے مسائل پر تو بہت دفعہ اس نے میری معلومات سے استفادہ کیا۔شریف حسین کی عمر پینتیس سال سے اوپر نہ تھی مگر کثرتِ سجدہ سے ماتھے پر محراب بن چکی تھی۔اُس نے تو خیر مجھے یہ بات نہیں بتائی البتہ ایک دفعہ میرے ساتھ کام کرنے والے مزدور کی زبانی معلوم ہوا کہ 'مسجد کے سامنے والے گھر کی جمیلہ کے ساتھ چار سال پہلے اس کے عشق کا قصہ چلا تھا۔یہ اُس سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن چودھری سلیم نے رشتہ نہیں دیا۔حالات کافی بگڑ گئے تھے مگر پھر چپ چاند ہوگئی۔اب پندرہ نومبر کو جمیلہ کی شادی چک راڑے کے چودھری جمیل کے بیٹے سے طے ہے لیکن اس بارے میں میرے سوا کسی کو کان وکان خبر نہیں بلکہ یہ شادی کسی سبب سے فقط ایک قسم کی خاموش رخصتی ہی ہوگی۔' بہرحال مجھے ان باتوں سے کچھ غرض نہ تھی۔میں تو یہ جانتا تھا کہ اس کسمپرسی اور قحط الرجال کے دور میں اس کی ذات میرے لئے غنیمت تھی۔اکثر میٹھی لسّی بنا کر لے آتا اور نہایت اخلاق کے ساتھ پیش آتا۔میں اس کا یہ رویہ دیکھ کر اُس کے مکان میں اُٹھ آیا۔شریف حسین نے ایک کمرہ رہنے کو مجھے دے دیا، جس کا دروازہ بازار کی طرف کھلتا تھا۔یہاں مجھے ہر قسم کا سکون میسر تھا کیونکہ ایک تو اُس کا گھر بہت صاف ستھرا تھا۔دوسرا مجھے اُس کے ہاں اسلحہ کے نام سے ایک چھری تک دیکھنے کو نہیں ملی۔بہت دھیمے لہجے میں بات کرتا۔غصہ کیا چیز ہوتی ہے۔شریف اس سے واقف نہیں تھا۔میں پانچ بجے شام چھٹی کرتا۔نہا دھو کر صاف کپڑے پہنتا اور باہر بازار کے سامنے مونڈھا بچھا کر اخبار کے کالم یا دوکاندار سے منگوائی گئی کتابوں کی ورق گردانی شروع کر دیتا۔میرے رنگ وروغن سے تو آپ واقف ہی ہیں۔راہ چلتی

بالیاں مچل مچل کر رہ جاتیں مگر جناب میں ایک ہی کائیاں۔ اصل میں تو قصبے والوں کے خوف سے لیکن ظاہراً اپنی فوں فاں قائم رکھنے کو آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھتا اور مطالعے میں مگن رہتا۔ ایک دن اسی سلسلے میں ایک لطیفہ بھی ہوا۔

''ایک شام اسی طرح شریف حسین کے مکان کے سامنے بیٹھا میں اخبار پڑھ رہا تھا کہ پچاس لوگوں کا مجمع غل غپاڑہ کرتا ہوا میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ مَیں سہما، کہ بھئی آج جان گئی، ہو نہ ہو ان کو میرا بازار بیچ بیٹھنا اچھا نہیں لگا۔ اب تو مارے گئے۔ کوئی پناہ دینے والا بھی نہیں اس لئے کہ شریف حسین تو فساد سے دُور رہنے والا محض ایک نمازی سا آدمی ہے۔ اُس وقت پہلی دفعہ مجھے کسی فسادی کی دوستی قابلِ رشک محسوس ہوئی۔ مَیں نے سوچا، شریف حسین نہ بچا سکے گا۔ ٹانگیں کانپنے لگیں اور میں پسینے سے شرابور ہو گیا۔ اسی اثنا میں میرے دائیں والا بولا، 'یہ لو دکھا دیا آپ کو۔ یہ ہے وہ لڑکا جسے میں نے آپ کے قصبے میں پڑھتے ہوئے دیکھا۔ لو جلدی کرو اب نکالو دو ہزار روپیہ۔ مَیں شرط جیت گیا۔'

''دراصل یہ ایک دودھ والا تھا جو روزانہ میرے پاس سے گزرتے ہوئے عجیب نگاہوں سے گھورتا تھا۔

''اسی وقت دوسرا بولا، 'شرط ہم جیتے ہیں کیونکہ یہ تو ہمارے قصبے کا ہے ہی نہیں۔'

''اب مجھے اصل بات کا پتہ چلا کہ اصل میں گوالے اور اس قصبے والے کے درمیان اس بات پر شرط لگی تھی کہ آیا پڑھنے والا لڑکا اس قصبے کا ہے یا نہیں۔ گوالا کہتا تھا کہ اس نے ایک پڑھا کو لڑکا دیکھ لیا جو اس قصبے کا ہے، جب کہ قصبے والے ماننے کے لئے تیار نہیں تھے۔ آخر گوالا شرط ہار گیا۔''

''اچھا بھئی یہ تو ہوئی ایک بات، اب اصل کہانی کی طرف آیئے۔ دن ایک گھڑی رہ گیا۔''

''بس یار تسلی رکھ کہانی بہت کم رہ گئی۔

''ہوا یہ کہ مجھے اس مکان پر رہتے ہوئے چار مہینے ہو گئے۔ شریف حسین نے میری تواضع میں کوئی کسر نہ چھوڑی، نہ ہی میں نے اس میں کوئی اوچھی حرکت دیکھی۔ وہ پڑھا تو بالکل نہیں تھا لیکن گنواروں والی بھی اس میں کوئی بات نہیں تھی۔ مَیں نے ایک دو دفعہ اُسے باور کرایا کہ یہ قصبہ اُس کے رہنے کے لائق نہیں۔ اُسے کہیں اور چلا جانا چاہیے۔ لیکن شریف کا کہنا تھا کہ وہ آباؤ اجداد کی قبریں اور سینکڑوں ایکڑ زمین چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہے۔ ویسے بھی قصبے والے اُس کی شرافت کی وجہ سے اُس کے منہ نہیں آتے۔ وہ اس بات میں سچا بھی تھا۔ واقعی میں نے ان چار ماہ میں کسی فرد کو نہیں دیکھا جو اس کے ساتھ ذرا بھی بدتمیزی سے پیش آیا ہو۔ ایک دن مسجد کے بیرونی دروازے پر کام جاری تھا۔ میں دروازے کے اوپر بیٹھا چھوٹے میناروں پر نقش و نگار بنانے میں

مصروف تھا کہ شریف حسین سرمئی رنگ کی چادر لپیٹے مسجد میں داخل ہوا۔ پندرہ بیس منٹ تک میرے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ میں نے محسوس کیا آج اُس کی آواز میں تھوڑی سی لرزش تھی، غالباً کچھ بخار بھی تھا۔ بہر حال اُس کے بعد وہ مسجد کی محراب میں جا بیٹھا اور نوافل پڑھنے میں مصروف ہوگیا۔ پھر وہ محراب سے نہیں اُٹھا، حتیٰ کہ ظہر کی اذان ہوگئی۔ اُس کے بعد مولوی صاحب نماز پڑھا کر گھر چلے گئے اور میں کھانا کھا کر دوبارہ کام میں مصروف ہوگیا۔

''تین بجے اچانک دو کاریں سامنے والے گھر کے آگے آکر رُک گئیں۔ اسی لمحے گھر کا دروازہ کھلا اور چار آدمی اندر چلے گئے۔ مجھے اپنے کام سے غرض تھی ۔ مَیں نے ایک لحظہ انہیں دیکھا اور کام میں مصروف ہوگیا۔ تھوڑی دیر بعد سیمنٹ کی ضرورت پڑی جس کے لئے مَیں نے مزدور کو آواز دی لیکن کوئی جواب نہ آیا۔ پلٹ کے دیکھا تو مزدور غائب تھا۔ کچھ دیر انتظار کیا مگر وہ مسلسل غائب اسی لمحے میری نظر سامنے والی سڑک پر پڑی۔ وہ بھی بالکل ویران تھی۔ پھر اچانک میرا دل یہ دیکھ کر دھک سے رہ گیا کہ چوک کے درمیان سے رشید میاں بھی غائب تھا۔ پچھلے چار مہینوں میں رشید میرے لئے چوک میں ایک ستون کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ اِس وقت اُسے یہاں موجود نہ پا کر مجھے سب سے بڑا دھچکا لگا۔ اب مَیں نے سمجھا کہ کوئی انہونی بات ہوگئی ہے کیونکہ اس پورے سناٹے میں واحد میری ذات تھی جو ذی روح محسوس ہو رہی تھی۔ یا پھر پیپلوں کے پتوں کی سرسراہٹیں تھیں۔ اس عالم میں مجھے ایک انجانے خوف نے گھیر لیا اور یہ سب رشید کے چوک سے غائب ہو جانے کی وجہ سے تھا۔ قصہ مختصر میں ابھی یہ جائزہ ہی لے رہا تھا کہ کیا کِیا جائے کہ اسی لمحے شریف حسین تیزی سے محراب سے اُٹھا اور آنکھ جھپکنے سے پہلے دروازے پر آ گیا۔ اس نے جب انتہائی پھرتی سے اپنے اوپر سے چادر ہٹا کر دور پھینکی تو میرے دیدے پھٹے رہ گئے۔ کلاشنکوف اور سینکڑوں گولیاں اُس کے جسم سے بندھی ہوئی تھیں۔ وہ پھر جلدی سے اسی گھر میں داخل ہوا۔ علاوہ ازیں بازار میں دائیں بائیں دو چھڑکاؤ کیے۔ پھر دو تین منٹ گولیوں کے چلنے کی آوازیں آئیں میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ کس طرف بھاگوں، اُسی لمحے وہ دوبارہ ایک دلہن کو کھینچتے ہوئے دروازے سے باہر نکلا۔ ایک دو برسٹ اسی دروازے پر پھر مارے۔ اُس کے بعد کلاشنکوف کا رُخ میری طرف کرتے ہوئے حکم دیا کہ جلدی نیچے اُترو۔ مجھے ہوش تو کچھ نہ رہا البتہ اتنا یاد ہے کہ اُس کا حکم بے چون وچرا مان لیا۔ اُس کے ایک ہاتھ میں دلہن کا بازو تھا اور دوسرے میں کلاشنکوف۔ ہمیں دوڑاتے ہوئے سیدھا بلھے شاہ کے والدین کے مقبرے پر لے آیا پھر اندر داخل ہوتے ہی دروازہ بند کر دیا اور مجھے حکم دیا کہ ایک منٹ کے لئے فوراً مرغا بن کر کان پکڑ لو۔ مَیں نے ایک دفعہ تو اُسے

ملتجی نظروں سے دیکھا پھر جلد ہی حکم کی تعمیل کر دی۔‘‘

’’واہ بھئی، ہمارے عہد کے عظیم افسانہ نگار، کاش میں کیمرہ لیے وہاں کھڑا ہوتا۔ یار تم تو بالکل ہی بزدل نکلے ہو۔ بندے کو کچھ تو اَنا ہو۔‘‘

’’لالہ جی! خدا گواہ ہے۔ اُس کی آنکھوں میں خون اُترا ہوا تھا۔ اُس وقت وہ مجھے شریف حسین نہیں بلکہ ڈریکولا لگ رہا تھا۔ بدمعاش کی بالکل ہی جون بدل گئی تھی۔ مجھے پتہ تھا ذرا بھی انکار کیا تو کہے گا کہ یہ مقبرے صرف قصبے والوں کو امان دیتے ہیں۔ پھر ایک منٹ ہی کی تو بات تھی۔ اور وہاں کوئی دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔‘‘

’’لیکن اُس نے تیرے ساتھ ایسا کیّا کیوں؟‘‘

’’یہ مَیں نے بھی اُس سے پوچھا تھا۔‘‘

’’پھر کیا کہا اُس نے؟‘‘

’’اُسے اطلاع ملی تھی کہ مَیں نے آتے ہی اُس کی محبوبہ پر آنکھ رکھ لی تھی۔ وہی تو وہ نور تھا جو پیپلوں کی اوٹ میں گھر کے صحن کو روشن رکھتا تھا۔‘‘

’’ہت تیرے مزدور کی، آگے کیا ہوا؟‘‘

’’اُس کے بعد اُس نے فرمان جاری کیا کہ مولانا صاحب کان چھوڑو اور جلدی سے ہمارا نکاح پڑھو۔‘‘

’’اس سارے منظر میں ایک دفعہ تو میرا سر چکرا گیا لیکن پھر مجھے اپنے حواس بحال کرنے پڑے۔ کیونکہ کام بڑا سخت تھا۔‘‘

’’پھر؟‘‘

’’پھر جناب مَیں آپ کی اطلاع کے لئے عرض کر دوں کہ وقت پڑنے پر مَیں نکاح بھی پڑھا سکتا ہوں۔‘‘

’’جناب آپ کا جھوٹ پکڑا گیا۔‘‘

’’وہ کیسے؟‘‘

’’اس نکاح کے گواہ کہاں سے آئے؟‘‘

’’حضرت میرے ساتھ کام کرنے والا مزدور اور وہی رشید میاں کس مرض کی دوا تھے؟‘‘ □